ہے۔ اس لحاظ سے رجحانات و میلانات نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سیاست اور تجارت کے تقاضے بھی ملکوں اور قوموں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر رہے ہیں، جب کہ سائنس اور ٹیکنالوجی نے پہلے ہی فکر و عمل کی سرحدیں توڑ دی ہیں۔ امریکہ نئے عالمی نظام کی صدا بلند کر رہا ہے۔

۲۔ یہ نظام نو در حقیقت پرانا مغربی طرز حیات ہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مغرب کے ترقی یافتہ ممالک مشرق کے پس ماندہ نیز ترقی پذیر ممالک کو ایک نئی اور بدتر ذہنی غلامی کا پیغام دے رہے ہیں۔ گویا ایک نئی سامراجی نو آبادیات کی راہیں ہموار ہو رہی ہیں۔

۳۔ نری مادہ پرستی اور غیر متوازن مادی ثروت نے مغرب میں ایک شدید روحانی افلاس پیدا کر دیا ہے حتیٰ کہ مشرق کے بعض خطوں کے جوگی بھی یورپ اور امریکہ کے دولت مندوں کو روحانی تسکین کے نام پر کھلی ہوئی جنسی بے راہ روی اور کج روی میں مبتلا کر رہے ہیں۔

۴۔ انسان کا یہ نفسیاتی زوال و انتشار عصر حاضر کا سب سے پر خطر اور تباہ کن مسئلہ ہے۔ مسلم ممالک اور بعض جگہوں پر احیائے اسلام کے علم بردار بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکے۔ آئینی و جمہوری طور پر رائے عامہ کو ہموار کرنے کے بجائے تشدد کی واردات متعدد مقامات پر زندگی کو جہنم بنا رہی ہیں۔ یہ چیز صبر و تحمل کی کمی، حقیقت پسندی کے فقدان اور غلط اندازوں کے سبب ہو رہا ہے۔

۵۔ ان آفاقی حالات میں سب کچھ بے معنی ہے، تاوقتیکہ علوم و فنون کی پیش قدمیوں اور آلات و وسائل کی فراوانی کو صحیح رخ دے کر مفید تعمیری کاموں میں نہ لگا دیا جائے۔ اس کے لیے آج کی برق رفتار زندگی کے ہر دائرے میں مہارت کی ضرورت ہے، لیکن یہ مہارت بھی اسی وقت کار آمد ہو سکتی ہے جب بصیرت ایمانی زمانے کی رفتار کو ٹھیک سمجھ کر اس کی جہت کو درست کرنے کی ذہنی و عملی قوت کا ثبوت دے۔ تاریخ کا سبق یہ ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی پیچیدگی کو ایک معتدل قسم کی سادگی میں تبدیل کرنا پڑتا ہے لیکن یہ مہم سادگی سے انجام نہیں دی جا سکتی، اس کے لیے بڑی پر کاری کی ضرورت ہے۔ حالات کی گرہیں روشن دماغوں کی انگلیاں ہی کھول سکتی ہیں۔

تحریک اسلامی کے آیندہ مرحلے کا تناظر یہی ہے۔ اب اس مرحلے کا نقشہ کار مرتب کرنے کے لیے مندرجہ ذیل خطوط پر کام کرنا چاہیے۔

اول: جدید انسان کو ایک بہتر آفاقی متبادل کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے سرمایہ داری، ملوکیت، اشتراکیت اور لادین جمہوریت کا پول اچھی طرح کھول کر، ایک بدرجہا بہتر نظریہ زندگی اور نظام حیات کی حیثیت سے اسلام کی تعلیمات واضح کر دی ہیں۔ انھوں نے عصر حاضر کی تحریک اسلامی کا تنظیمی طریق کار بھی نہ صرف معین کر دیا، بلکہ اس کے مطابق کام کرنے کے لیے قیادت کا نمونہ عمل بھی پیش کر دیا۔ ان کے تدبر اور تدبیر کے اثرات بھی عصر حاضر میں اسلام کے صحیح تعارف

کی حد تک اہل نظر کے سامنے آگئے۔ لیکن نمونے کا سماج اور نمونے کی ریاست کا قیام نہیں ہو سکا، جس کے سبب مولانا کا فکری لٹریچر، عملی تبلیغ کی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکا۔

دوم: اقبال اور مولانا مودودی دونوں نے اپنے زمانے اور مستقبل کی حقیقتوں کو جس ہمہ گیر بصیرت کے ساتھ سمجھا اور انسانیت کی نشاۃ ثانیہ کے لیے فکر و عمل کا جو وسیع البنیاد خاکہ مرتب کیا تھا اس کا شعور آج کے اسلامی دانش وروں کے درمیان عام نہیں ہے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قائدانہ وسعت نظر اور استقامت کردار دونوں کا فقدان ہے۔ تحریک اسلامی کے کئی دھارے بالعموم یا تو خانقاہی تصوف کے رویے کی طرف مائل ہو چکے ہیں، یا خرابی احوال سے متاثر ہو کر سیاست زدہ ہیں۔ اس لیے تحریک اسلامی کو جلد سے جلد اس کے بنیادی و کلی موقف اور رخ پر لانا ہو گا۔ اس سلسلے میں نہ تو دین کی نئی تعبیر کی ضرورت ہے، نہ شریعت میں اجتہاد کی، جب کہ اس تعبیر و اجتہاد کی اہلیت بھی بروقت نایاب ہے۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ مولانا مودودی نے اسلامی نظریے کا اطلاق جس طریقے سے حالات و مسائل پر کرنے کی کوشش کی، جس انداز سے وہ تحریک اسلامی کو سیاست وقت میں لائے، اس کا گہرا مطالعہ ان کے بیانات و اقدامات کی روشنی میں کیا جائے۔ اس کے علاوہ مولانا کے انداز فکر اور طریق کار کا موازنہ اجتماعی امور میں مشرق وسطی یا عالم عرب کی اسلامی تحریک کے ہم برداروں کے رویے اور عمل کے ساتھ کر کے دیکھا جائے کہ دونوں کے درمیان مشابہت کتنی ہے اور فرق کتنا؟ اور اگر فرق ہے تو اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے؟ راقم السطور کا احساس یہ ہے کہ مولانا مودودی نے عصر حاضر کے ذہن و مزاج کو اپنے ہم عصر داعیان تحریک اسلامی سے بہتر طور پر سمجھا تھا۔ اسی لیے انھوں نے زیادہ زور پر امن آئینی و جمہوری ذرائع سے ایک طویل المیعاد منصوبے کے تحت رائے عامہ کو ہموار کرنے پر صرف کیا۔ اس کے علاوہ بنیادی امور کی پیہم وضاحت کرتے ہوئے وہ کردار سازی پر بیش از بیش توجہ دیتے رہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ ان کے بعد آئندہ مرحلے میں کوئی حقیقی پیش رفت اسی وقت ہو گی جب واقعات کا ایک تنقیدی جائزہ لے کر تحریک کو اس کے اصلی انداز اور فطری رفتار سے اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ وہ عملاً پوری زندگی پر اثر انداز ہو۔

سوم: اس مقصد کے لیے تنظیم کے ضوابط پر نظر ثانی کرنی ہو گی اور بدلتے ہوئے حالات میں ایسے مردان کار پر تنظیم کا دروازہ زیادہ سہولت کے ساتھ کھولنا ہو گا جو تحریک کو آگے بڑھانے کی اقدامی صلاحیت رکھتے ہوں، تاکہ انفرادی محاسبے سے بڑھ کر اجتماعی معاملے میں سبقت کی راہ ہموار ہو۔ ضابطہ پسندی مفید ہوتی ہے مگر ضابطہ بندی مضر۔ نصب العین مستقل ہو سکتا ہے مگر طریق کار متغیر، ورنہ تحریک جمود سے دوچار ہو گی۔ ایک بڑی تحریک کے قافلے میں ہر قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو ہر جہت سے قافلے کو منزل مقصود کی طرف بڑھاتے ہیں۔ لہٰذا تنظیم کے اندر وسعت ہونی چاہیے، جس

کے بغیر نہ تو وسائل میں اضافہ ہو سکتا ہے نہ بہتر مواقع حاصل ہو سکتے ہیں۔ پورے سماج پر اثر ڈالنے کے لیے ضروری ہے کہ سرگرمیوں میں تنوع ہو اور وہ اپنے دور کے ماحول کا احاطہ کر سکیں۔ اسلامی نظریہ زندگی اس جامعیت کے بغیر معاشرے میں نافذ ہو ہی نہیں سکتا' جب کہ ریاست کے انتظام پر حاوی ہونا ناقابل تصور ہے۔ ایک زندہ و فعال اور موثر تحریک کی تنظیم زندگی کے مختلف دائروں میں ہر طرح کے جو ہر قابل کی پذیرائی کرتی ہے اور افراد کو ان کی کارکردگی' نہ کہ محض وابستگی' کی بنیاد پر کام کرنے کے اختیارات دیتی اور ذمہ داری کے مناصب پر فائز کرتی ہے۔ اس سلسلے میں تحریک اسلامی کو جلد از جلد اپنا محاسبہ کر کے تنظیم کے اندر درستی و مستعدی اور چستی پیدا کرنی چاہیے' ورنہ محض لٹریچر کی اشاعت و تقسیم بلکہ مطالعہ بھی ایک افیون بن کر وابستگان کو فقط ذکر و فکر میں مست رکھے گا۔

چہارم: عصر حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے اور جدید ذہن کو خطاب کرنے یا نئی نسل کی کردار سازی کے لیے مشرق و مغرب دونوں جگہ تحریک اسلامی کا وہی انداز صحیح و موثر ہو گا جو مولانا مودودی نے قرآن و سنت کی روشنی میں اختیار کیا۔ اس سلسلے میں آج کے مسلم دانش وروں کو امریکہ اور یورپ کی تکنیکی ترقی سے مرعوب اور ایشیا و افریقہ کی موجودہ مغرب زدگی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔ جدیدیت اور تجدد کوئی کار تجدید نہیں ہے۔ جو کچھ تمدن و تہذیب اہل مغرب نے پیش کیا ہے اسے ایک نئی جاہلیت پر مشتمل قرار دینا کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔ دانش حاضر کے اس سحر قدیم کا مقابلہ کرنے کے لیے' علم کلام گذشتہ نصف صدی کے اندر اسلامی لٹریچر میں فروغ پا چکا ہے۔ مسلم دانش وروں کو اعداد و شمار کی جادوگری کے بجائے حقائق کی تصریح پر زور دینا چاہیے اور اقدام و عمل سے کام لینا چاہیے۔ انقلاب مفاہمت سے نہیں' مجاہدے سے رونما ہوتا ہے۔

پنجم: تحریک اسلامی کے لیے ایک حل طلب مسئلہ ان سوالات کا جواب دینا ہے جو آج مختلف ملکوں میں مختلف طریقے سے سیاست و معیشت و معاشرت کے دائرے میں جمہوریت کی نوعیت' سود کی حقیقت اور عورتوں کے حقوق کے بارے میں اٹھ رہے ہیں یا اٹھائے جا رہے ہیں۔ جمہوریت تو بہرحال شورائیت کی ایک شکل ہے' جس کی اصلیت خلافتِ راشدہؓ کے دور میں نمونے کے طور پر دنیا کے سامنے آچکی ہے اور اس کی موجودہ شکل بعض معمولی ترمیمات کے ساتھ قابل قبول ہو سکتی ہے' بلکہ اس کی اصلاح کے لیے بھی اس کے مروجہ عمل میں شرکت کی جا سکتی ہے' جس کے لیے پیشگی شرط لگانے کی نہ تو ضرورت ہے نہ اس کا موقع۔ سود کا معاملہ بہت پیچیدہ ہے' اور خاص کر غیر مسلم اکثریت کے ممالک میں عملاً ایک مدت کے لیے ناقابل تصفیہ' جس کے دوران میں موجودہ بینکنگ سسٹم سے بالکل الگ رہنا تقریباً ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ کیا اضطراری طور پر اور محتاط طریقے سے اس میں شرکت نہیں کی جا سکتی؟ عورتوں کے حقوق جس حد تک اسلام نے شروع سے دے رکھے ہیں آزادی نسواں

کی مغربی تحریک بھی نہیں دلا سکی ہے۔ بہرحال، یہ فقہی مسائل اگر اجتہاد کا تقاضا کرتے ہیں تو اس کو بھی مولانا مودودی کے لٹریچر نے بڑی اور بنیادی و عمومی حد تک پورا کر دیا ہے۔ عصر حاضر میں فقہ کی مکمل نئی تدوین، اس کے لیے مطلوب اجتہادی صلاحیت اور ضروری وسائل و مواقع نمایاں طور پر دستیاب نہیں ہیں۔ بروقت اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہ کہ مجالس قانون ساز مستند علماے دین اور معتبر ماہرین قانون کے باہمی مشورہ و تعاون سے علامہ اقبال کی تجویز کے مطابق اجتماعی اجتہاد سے کام لیں، بشرطیکہ مسلم رائے عامہ ان کے فیصلوں پر اعتماد کا اظہار کر کے ان کو کھلے طور پر اپنی مرضی سے تسلیم کرلے۔

ششم: کوئی تحریک مستقل و مسلسل فلاحی و رفاہی کاموں کے بغیر نہ تو پایدار ہو سکتی ہے نہ ترقی کر سکتی ہے۔ یہ کام وقتی و عارضی طور پر مصیبت زدوں کی راحت رسانی تک محدود نہیں ہو سکتا۔ اس کے وسیع دائرے میں مثالی بستیوں کا قیام و انتظام بھی شامل ہونا چاہیے اور عام لوگوں کو سماجی انصاف دلانے کے ادارے بھی۔ صنعت و حرفت کی تربیت اور روزگار و کاروبار کی فراہمی بھی حتی الوسع کرنے کے کام ہیں۔ ریاست اندرون ریاست بنانا اور چلانا تو محل نظر ہے اور مشکل بھی، لیکن معاشرے میں متبادل نظام کے طور پر اسلامی نظام حیات کے غیر سرکاری نمونے پیش کرنا عام لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے کے علاوہ تحریک کے کارکنوں کی تربیت کے لیے بھی مطلوب ہے۔

ہفتم: علوم و فنون اور ادبیات میں اسلامی نقطہ نظر کی پیش کش ان دائروں کے معروف و مسلم ضوابط و لوازم کے مطابق ہونی چاہیے، تاکہ معیار کا تعین ہو سکے اور اہل نظر ایک خوش گوار تبدیلی و ترقی کا احساس کر سکیں، ورنہ نعرہ بازی اور بلند بانگ دعوے بے اثر ہوں گے۔

ہشتم: سیاست وقت میں ایسی فراست و جرات سے کام لینا ہے کہ ایک اقدامی قیادت بھی بن سکے اور تحریک کو آگے بڑھانے کی راہیں بھی ہموار ہوں۔ اس سلسلے میں فقیہانہ تاملات سے کام نہیں چلے گا، حکیمانہ پیش قدمی سے کام لینا ہو گا۔ اس مقصد کے لیے ایک تو حالات حاضرہ کا پورا ادراک ضروری ہے، دوسرے حل مسائل کی موثر تدبیر۔ اس سلسلے میں جدوجہد کی تدریج و ترتیب جو بھی ہو، حقیقت پسندی و بصیرت مندی اور پیہم حرکت و عمل ضروری ہے۔ عصر حاضر میں سیاسی بے خبری اور غفلت یا سستی کے ساتھ کوئی تحریک چل نہیں سکتی، نہ اس کو مردان کار مل سکتے ہیں، نہ وہ رائے عامہ پر اثر ڈال سکتی ہے، یہاں تک کہ اس کی صحیح پہچان بھی نہیں ہو سکتی۔ بلکہ اس کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلانے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کھلی چھوٹ بدخواہوں کو آسانی سے ملتی رہے گی۔ سیاسی سرگرمیوں سے بیگانہ رہ کر ایک کلی نظام زندگی اور مکمل ضابطہ حیات کی حیثیت سے اسلامی نظریے کا نہ تو تعارف ہو سکتا ہے نہ اس پر عمل۔ قانون سازی اور نظم حکومت کو نظرانداز کرنے کا مطلب ہے ترک دنیا اور نتیجہ محکومی و مجبوری و مسکینی و نومیدی جاوید۔

نہم: پسماندہ اقوام و طبقات اب اپنے ساتھ ہونے والے مظالم کی تلافی اور ان کے سد باب کے لیے سماجی انصاف اور مساوات سے بڑھ کر اقتدار کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ یہ ایام کی گردش کا تقاضا بھی ہے اور چیرہ دستوں کے خلاف فطرت کی تعزیر بھی۔ اس سلسلے میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا نظریہ ایسا نہیں جو ان اقوام و طبقات کی تسلی اور ان کے عزائم کی تکمیل کر سکے مگر ان کے اور اسلام کے درمیان مسلمان ہی اپنی شامت اعمال سے دیوار بن کر کھڑے ہیں۔ لہٰذا تحریک اسلامی کو اپنی تبلیغ اور کارگزاری سے یہ دیوار گرانی ہوگی تاکہ اسلام کا اصلی چہرہ لوگوں کی نگاہ میں آ سکے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں قرآن کے لفظوں میں مستضعفین کہنا چاہیے، یعنی ایسے لوگ جو پیہم استحصال سے کمزور بنا کر رکھے گئے، لیکن اگر وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہوں تو عباد الصالحون یعنی نیک بندے بن کر قرآنی لفظوں میں زمین کے وارث و مالک ہو سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر بھارت کے اچھوتوں کو وہ برابری اور برادری، مسلم سماج سے باہر کہیں نہیں مل سکتی جس کے وہ طالب اور آرزومند ہیں، اس لیے کہ ہندو سماج ان کو ہریجن بنانے کے سوا کچھ کر نہیں سکتا اور بدھوں یا عیسائیوں کا کوئی قابل ذکر سماج ملک میں ہے ہی نہیں۔ چنانچہ صنم خانے سے کعبے کو پاسباں مل سکتے ہیں، اگر کعبے کے متولی اس کے روادار ہوں۔ اس رواداری کا ایک ثبوت دینے کے لیے مسلم سماج کے اندر محض معاشی یا سیاسی مفاد کے لیے پس ماندہ ذاتوں کی جو تفریق زبردستی کی جا رہی ہے اس کو روکنا اور ختم کرنا ہوگا۔

دہم: تحریک اسلامی کو ایک تحریک انسانیت کی شکل میں آگے بڑھنا ہوگا۔ مسلمان کوئی مذہبی و نسلی فرقہ نہیں، ایک نظریاتی ملت ہیں اور ان کا نظریہ آفاقی ہے۔ لہٰذا دنیا کی فرقہ وارانہ، طبقہ پرستانہ اور قوم پرستانہ کش مکش میں ملت اسلامیہ ہی ثالث بالخیر بن سکتی ہے۔ اسلامی توحید کا پیغام بنی نوع انسان کے لیے عام ہے۔ اس معاملے میں اکثریت اور اقلیت کا کوئی مسئلہ درپیش نہیں، سوال صرف نظریاتی قوت، اس کے شعور اور اس کے مطابق کردار کا ہے، جس کی توقع تحریک اسلامی سے ہی کی جا سکتی ہے، اور اس کی تکمیل کے بغیر ملت اور انسانیت کے مستقبل کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔

ان نکات کی روشنی میں تحریک اسلامی کو ماضی کی تاریخ سے سبق لے کر اپنی کوششوں کا ہدف مستقبل کی بہتری کو بنانا چاہیے۔ روایت کا پورا احترام کرتے ہوئے فکر و عمل کی جدت سے کام لینا چاہیے، واقعات کو مدنظر رکھ کر تجربات کرنا چاہیے۔ اقدار کا تحفظ ہر حال میں کیا جائے مگر مسائل سے صرف نظر کسی حال میں نہ کیا جائے۔ ماضی کی یاد اور مستقبل کی امید دونوں کی بقا کا انحصار حال کی سعی و جہد پر ہے۔ لہٰذا آیندہ مرحلے میں تحریک اسلامی کو حقیقت پسندی اور اولوالعزمی، دونوں کے ساتھ گامزن ہونا چاہیے۔

رسائل و مسائل

تعویذ اور شرک

آپ نے کلام نبویؐ کی صحبت میں (ص ۹۶) رقی تسترقیہا کا ترجمہ کرتے ہوئے دعا کے ساتھ تعویذ بھی لکھا ہے۔ احادیث صحیحہ میں تعویذ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ اگر دعا کے ساتھ دم کرنے کا ذکر ہوتا تو قابل اعتراض نہ ہوتا۔

آپ نے ترجمان میں تقدیر کے سلسلہ میں شائع ہونے والی ایک حدیث کے بارے اپنے اضطراب کا اظہار کیا ہے اور محمد بن عبدالوہاب کی کتاب التوحید کے تفصیلی اقتباسات بھیجے ہیں جو تعویذ کو شرک قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ کو چند باتوں پر غور کرنے کی دعوت دوں گا۔

۱۔ میں نے رقی تسترقیہا کا ترجمہ ''دعا تعویذ'' مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم کی کتاب زادِ عمل سے درج کیا تھا۔ سلف سے یہی روش چلی آرہی ہے اور میری بھی روش یہی ہے کہ جن علما پر اعتماد ہو کہ دین کا صحیح علم و فہم رکھتے ہیں، ایک کم علم والا آدمی ان کی پیروی کرے تو یہ احتیاط اور خیر کی روش ہے۔ الا یہ کہ میرے علم کی حد تک مجھے کوئی بنیادی اختلاف یا اضطراب محسوس ہو۔

۲۔ یہ بات مجھے بھی معلوم تھی اور یقیناً مولانا جلیل احسن ندوی مرحوم کو مجھ سے بدرجہا زیادہ بہتر معلوم ہوگی، کہ یہ لفظ پڑھ کر پھونکنے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں، اور شاید وہ بھی یہ سمجھتے ہوں کہ جب تک نفع و ضرر کی نسبت صرف اللہ کی طرف رہے، اس وقت تک تعویذ جھاڑ پھونک کی طرح کا عمل ہے۔ ایک عمل میں الفاظ منہ سے ادا کیے جاتے ہیں، دوسرے عمل میں کاغذ پر لکھے جاتے ہیں۔ اسی لیے غالباً انھوں نے ترجمے میں وسعت اختیار کی، اور اسی لیے میں نے اس میں کوئی بات غلط نہیں سمجھی۔ ترجمہ لفظی نہ ہو، تو روایت بالمعنی کے طرح، تھوڑی بہت تشریح و توضیح اس میں داخل ہو جاتی ہے۔

۳۔ میری نظر میں شرک کا تعلق بنیادی طور پر عقیدے سے ہے اور پھر ان اعمال سے جو واضح طور پر عبودیت کے اظہار یا سلسلہ اسباب و علل سے بالا ہو کر کسی غیراللہ کے لیے نفع و ضرر کی نسبت پر مشتمل ہوں۔ یا کسی بھی غیراللہ کو 'ماسوا اللہ مطلقاً نافع و ضار' سمجھے۔ اس لحاظ سے اگر کوئی یہ سمجھے کہ شفا دوا سے نصیب ہوتی ہے، نہ کہ اللہ کے دینے سے، تو یہ بھی شرک ہو گا۔ کوئی کلام الٰہی سے جھاڑ